ڈاکٹر سید عامر سہیل
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا
احمد عبداللہ
لیکچرر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج دوتے والا، بھکر

عالم گیریت: تناظرات و امکانات

Globalization is a postmodern phenomenon and we are living in this situation. Most of the world languages are affected by this phenomenon. Globalization has its own social, political, economic and literary agenda which has been controlled by the West. This article depicts and discusses the historical and critical prospective of globalization

عالم گیریت بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں بحث کا عنوان بنا اور دنیا میں ایک عالمگیر تہذیب کے وقوع پذیر ہونے کی بات شروع ہوئی لیکن ڈاکٹر مبارک علی اسے یونانی عروج سے آغاز کرتے ہیں:

> اگرچہ موجودہ دور کا گلوبلائزیشن ایک مختلف شکل اور مختلف حالات میں ابھر رہا ہے مگر تاریخ میں یہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے چاہے اس کے اثرات محدود کیوں نہ ہوں۔ مگر یہ جہاں جہاں گیا اس نے تسلط شدہ علاقوں کی سیاست، معیشت اور کلچر پر اثر ڈالا ہے مثلاً یونانیوں کے سیاسی تسلط یا امپیریل ازم کو لیجیے جس کا عروج سکندر اور اس کی فتوحات سے ہوا، اس کے نتیجہ میں جو ایک یونانی گلوبلائزیشن عمل میں آیا اس نے ان علاقوں کی ساخت میں تبدیلی کی کہ جہاں ان کا تسلط تھا۔[۱]

اس تناظر میں وہ یونانیوں کے برصغیر پر اثرات کے حوالے سے گندھارا کلچر کی مثال دیتے ہیں۔ رومی دور کے حوالے سے ان کے زیر تسلط آنے والے علاقوں میں لاطینی زبان کا فروغ زبان کی عالم گیریت کا مظہر ہے۔ عرب جن کو اپنی زبان پر اتنا ناز تھا کہ غیر عربوں کو ''عجم'' یعنی گونگا کہتے تھے جہاں گئے اپنی زبان ساتھ لے گئے۔ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ پر تسلط کے نتیجے میں وہاں کی زبانوں پر عربی زبان غالب آ گئی۔ فارسی بولنے والے مسلمان برصغیر میں آئے تو سنسکرت جو یہاں شاہی سرپرستی میں تھی اپنا رتبہ کھو کر محض مذہب کی زبان بن کر رہ گئی۔[۲]

زبان کو ہم نے یہاں تہذیب کے ایک اہم مظہر کے طور پر بیان کیا ہے۔ زبان کے تہذیب پر اثرات دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یوں عالم گیریت کوئی نیا مظہر نہیں ہے تاہم تناظر مختلف ہے کہ اب عالم گیریت میں سب سے اہم کردار علوم و فنون اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کا ہے اس کا ذکر آگے چل کر تفصیل سے ہوگا تاہم یہاں عالم گیریت کے فروغ میں میڈیا بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کے اثرات کا ذکر سود مند ہوگا۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں انسان کا زمین کے دوسرے خطوں میں بسنے والے انسانوں سے تعامل رہا ہے جس کی بنیاد عموماً طور پر تجارت فراہم کرتی رہی اور مقبوضات کا شوق بھی اس میں معاون رہا تاہم یہ تعامل اتنی سست رفتاری سے ہوا کہ اس کے ذریعے کوئی بہت بڑی تبدیلی وقوع پذیر نہ ہوتی تھی علاوہ ازیں یہ محدود سطح پر ہوتا تھا اس لیے اس کے اثرات بھی محدود ہوتے، سفر سے واپس آنے والے انسان نئی تہذیبوں، مذاہب، اور جغرافیوں کا احوال سناتے اور لوگ دانتوں میں انگلیاں داب کر اسے سنتے، تخیل کا گھوڑا سرپٹ دوڑتا اور داستانیں وجود میں آتیں جس میں ان دیکھی جگہوں اور معاشرت کا احوال مانوس معاشرت میں آمیز ہوتے۔ یہ تہذیبی پیوند تھے جو آہستہ آہستہ انسانوں میں اجنبیت کی دیواریں ہموار کرنے میں موثر ثابت ہو رہے تھے۔ لیکن یہ تبدیلی اس وقت رفتار پکڑ گئی جب انسان نے پرنٹ میڈیا اور پھر اس کے بعد الیکٹرانک میڈیا میں قدم رکھا اب وہ پوری دنیا کے احوال سے پلک جھپکتے میں باخبر ہونے کی اہلیت سے لیس ہو چکا تھا۔ اس نے اجنبی دیسوں میں بسنے والے باشندوں کو سکرین پر دیکھا، ان کی تہذیب و ثقافت سے آشنائی حاصل کی ان کے کھانے پینے کے معمولات، لباس، زبان، اطوار، غرض یوں لگا جیسے انھیں میں موجود ہے اسے بہت سی باتوں میں اشتراک محسوس ہونے لگا۔ کہیں کہیں افتراق تھا جس نے سوچنے کی صلاحیتوں کو مہمیز دی۔ اول اول انسان ہونے کے ناطے اپنائیت کے احساس بیدار ہوئے اور پھر بار بار کے اس عمل سے اس کی سوچ اپنی قوم، ملک، علاقے اور براعظم سے پرواز کرتی ہوئی دنیا کو محیط ہونے لگی۔ انسانی تخیل میں یہ گلوبلائزیشن کی ابتدا تھی کہ اختلافات و اشتراکات کے باوجود وہ اپنے ہم جنسوں سے تعارف حاصل کر رہا تھا اور اس کے سامنے زندگی کا کینوس وسیع تر ہو رہا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اس مخصوص تناظر میں جس کا گزشتہ سطور میں ذکر ہوا عالم گیریت ایک نظریے کے طور پر کیوں وجود میں آئی؟ یہ بات تو عام فہم ہے کہ یہ مغربی تہذیب کا پیدا کیا ہوا نظریہ ہے۔ کیوں کہ عالم گیریت کے حوالے سے جس تہذیب کا نقشہ ابھارا جا رہا ہے اس میں مغربی تہذیب نمایاں ہے۔ سموئیل پی ہنٹنگٹن اس 'کیوں' کا جواب یوں دیتے ہیں:

> ایک مفروضہ تو یہ ہے کہ سوویت یونین کے انہدام کے بعد تاریخ ختم ہوگئی ہے اور ساری دنیا میں لبرل جمہوریت کو آفاقی فتح حاصل ہوگئی ہے۔[۳]

لیکن اس نظریے کو وہ خود ہی رد کر دیتے ہیں کہ سوویت یونین کے زوال نے مغرب کو پوری دنیا میں فتح دے دی ہے۔ ان کے خیال میں:

> انسانیت کی زیادہ اہم تقسیم نسلی، مذہبی اور تہذیبی بنیادوں پر باقی ہے اور نئے جھگڑوں کو جنم دے رہی ہے۔[۴]

دوسرا مفروضہ جسے سموئیل زیر بحث لاتے اور رد کرتے ہیں وہ لوگوں میں بڑھتے ہوئے تعامل بالخصوص تجارت، سرمایہ کاری، میڈیا، مواصلات وغیرہ کے حوالے سے جس نے ایک عالمی کلچر پیدا کیا ہے۔ اسے بھی وہ اس بنا پر رد کرتے ہیں کہ تجارت بڑھنے کے باوجود ممالک میں آویزش جاری ہے۔ تیسرے نمبر پر وہ عام طور پر بیان کی جانے والی ایک دلیل بیان کرتے ہیں جس کی رو سے یہ اٹھارویں صدی سے جاری جدیدیت کے طویل عمل کا نتیجہ ہے۔ جدیدیت میں شامل صنعت پذیری، شہریت پذیری، تعلیم، دولت اور سماجی بیداری جیسے ایجنڈے کا یہ منطقی نتیجہ ہے۔ دنیا کے جو ممالک اس ایجنڈے پر عمل کریں گے جدیدیت کی راہ سے عالمی ثقافت کا حصہ بنتے جائیں گے۔ لیکن وہ اسے بھی قبول نہیں کرتے کہ اگر تمام معاشروں کے جدید ہونے سے عالمی ثقافت پیدا ہوسکتی

ہے تو چند سو سال قبل جب تمام معاشرے روایتی تھے دنیا ایک سی کیوں نہیں تھی ان میں ثقافتی بُعد کیوں موجود تھا۔

برٹرینڈ رسل نے عالمی حکومت کے حوالے سے اس کی ضرورت محسوس کی ہے کہ سیاست دانوں کے سطحی زاویہ فکر و نظر ملکوں کو انتشار سے دوچار کرتے ہیں اور خود غرضی کے باعث جنگوں میں ملک جھونکنے سے گریز نہیں کرتے وہ کہتے ہیں:

> خوش آئند بات یہ ہے کہ اس بات کی اہمیت کو سمجھا جانے لگا ہے کیوں کہ حالیہ جنگوں کے نتیجے میں تباہی و بربادی اور بے روزگاری ایک ناقابل تلافی نقصان بن کر سامنے آئی ہے۔ لوگ اب یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ صرف ایک عالمی حکومت ہی جنگ کی تباہ کاریوں سے دنیا کو بچا سکتی ہے ورنہ ہماری زمین مزید ایک عالمی جنگ کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔[۵]

رسل کی یہ تحریر جن دنوں کی ہے، لیگ آف نیشنز بن چکی تھی جو بعد ازاں اقوام متحدہ کے روپ میں سامنے آئی گو یہ عالمی حکومت تو نہیں لیکن محدود مقاصد کے اعتبار سے عالمی حکومت کا نعم البدل بن سکتی تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اقوام متحدہ کا کردار لائق تعریف نہیں۔ اگر ہم اقوام متحدہ کو بین الاقوامی حکومت کا نام دے دیں جس کی رسل کے خیال میں دنیا کو سب سے زیادہ ضرورت ہے تو کیا سماجی ارتقا کی رفتار قومی حکومتوں سے زیادہ ہوگی؟ یہ ایک اہم سوال ہے اور پھر خود رسل بھی اس کی کامیابی ابتدائی درجوں میں مشکوک مانتے ہیں:

> مجھے یہ بھی خطرات لاحق ہوتے ہیں کہ بین الاقوامی حکومت ابتدا میں ظالمانہ طرزِ عمل اختیار کرلے گی جیسا کہ حکومتوں کی تاریخ میں ابتدائی حکومتوں نے کیا تھا تاہم اس خوف کی بنا پر ہم دنیا کے سینے پر نراجیت کا کابوس تو سوار نہیں کر سکتے۔[۶]

رسل بین الاقوامی حکومت کو دنیا کے مسائل کا منطقی حل قرار دیتے ہیں اس لیے کچھ عرصہ اس تجربے میں ضائع ہونے کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتے لیکن یہ عرصہ طویل ہے۔ دنیا اس کی متحمل ہو سکے گی؟

> انسان ایک بار پھر ایک دوراہے پر کھڑا ہے ایک طرف اسے زمانہ قبل از تہذیب اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور دوسری طرف اگر وہ تہذیب اور اس کے ثمرات کو بچانا چاہتا ہے تو اسے بین الاقوامی حکومت کے قیام کی ضرورت پر زور دینا ہوگا۔ اس قسم کی غیر جانب دار، اچھی یا بری حکومت زمین پر انسانی حیات کے تسلسل کو یقینی بنا سکتی ہے انسان نے زمین پر اپنی تاریخ کے پانچ ہزار برسوں میں فرعون کی مطلق العنانیت سے لے کر امریکی آئین تک کا سفر طے کیا ہے اور وہ شاید اگلے پانچ ہزار برسوں میں ایک بڑی اور جانب دار بین الاقوامی حکومت سے غیر جانب دار اور رجمہوری بین الاقوامی حکومت کا قیام ممکن بنانے میں کامیاب ہو جائے۔ اگر انسان کسی قسم کی بین الاقوامی حکومت کے قیام کوششوں میں ناکام ہو جاتا ہے تو اسے ایک مکمل تباہی کے بعد اپنا تہذیبی سفر روسو کے وحشی سے دوبارہ شروع کرنا پڑے گا۔[۷]

ایک بات جو ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ عالم گیریت کے نعرے کے پیچھے سرمایہ دار اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا کردار ہے۔ عالم گیریت ممکن ہے یا نہیں اس پر تو آگے چل کر مزید گفتگو ہوگی تاہم اسے پیدا کرنے کی کوشش میں اصل ہاتھ سرمائے کا ہے۔ موجودہ دنیا جو منڈی اور معیشت کی دنیا ہے کوئی نئی دنیا نہیں لیکن ایک اہم فرق ہے کہ قدیم تجارت ایسی اشیا کی بنیاد پر استوار ہوتی تھی جن

کی ضرورت ہوتی تھی ۔ضرورت کے مطابق اشیا پیدا اور فروخت کی جاتی تھیں لیکن اب اشیا پیدا کر کے اس کی ضرورت کے لیے تشہیری مہم چلائی جاتی ہے اور صارف کی نفسیات اس مہم میں ہدف بنائی جاتی ہے۔ یوں سرمایہ دارزائد اشیا بیچنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور صارف مزید محنت کر کے زائد آمدنی فراہم کرتا ہے تاکہ اضافی اخراجات کا بوجھ اٹھا سکے یہ محنت اس سے سرمایہ دار کرواتا ہے جس کا صارف کوکم ہی احساس ہوتا ہے۔ زائد محنت کی آمدنی صارف کے ذریعے سرمایہ دار تک پہنچ جاتی ہے۔ اب اس صورت حال میں ایک اور چیز شامل کیجیے جیسے نوآبادیاتی نظام کی ایک ضرورت اشیا کی فروخت یا صارف معاشرے کی تلاش تھی اب یہی ضرورت نوآبادیاتی نظام کی بجائے ملٹی نیشنل کمپنیز کی ہے وہ بین الاقوامی تشہیر کے ذریعے اپنی اشیا کے لیے منڈیاں تلاش کرتی ہیں اور اس ضمن میں جہاں مذکورہ معاشرے کو مدنظر رکھا جاتا ہے وہیں ان کے سامنے بین الاقوامی تناظر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اشتہار ایسے بنائے جاتے ہیں کہ ہو بہوبہی یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ بیشتر ممالک میں چلائے جاسکیں جیسے پورا اشتہار عین مین وہی لیکن آخر پر ہندوستان اور پاکستان میں الگ الگ پیغام’’Healthy ہوگا ہندوستان‘‘یا’’ Healthy ہوگا پاکستان‘‘ یہ ایک مثال ہے اس بات کی تفہیم کے لیے کہ سرمایہ داراورملٹی نیشنل کمپنیز کو صارف چاہیے وہ کسی بھی تہذیب سے تعلق رکھتا ہوکسی زبان کا بولنے والا ہو، مذہبی ہو یا مذہب بیزار، اور وہ اشتہار بناتے وقت ان سب چیزوں کو مدنظر رکھتے ہیں جس سے بین الاقوامیت کا تصور عالم گیریت کی طرف سفر کرتا ہے۔ولادیسلاف کیلے اور ماتوئے کوائزون ثقافتی بین الاقوامیت کے حوالے سے کہتے ہیں:

> جدید صنعت، سائنس، ذرائع نقل وحمل اور رسل ورسائل کی ترقی ،محنت کی عالمی تقسیم اور بین الاقوامی معاشی رشتوں میں اضافہ آبادی کی بڑھتی ہوئی نقل وحرکت اور ثقافتی تعلقات زبردست عناصر ہیں جن کی مدد سے ہر قوم کا کوئی بھی ثقافتی کارنامہ مختصر مدت میں تمام انسانیت کی خدمت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔[۸]

لیکن اس حوالے سے ان کے کچھ تحفظات ہیں کہ طے شدہ منصوبے کے تحت بورژوا ثقافت کی نشوونما کی جاتی ہے ان کے خیال میں سرمایہ داری نظام سے زیادہ اشتراکی نظام میں بین الاقوامی ثقافت کی نشوونما کے امکانات ہوتے ہیں ۔

دیکھنا یہ ہے کہ عالم گیریت کے لوازمات کون کون سے ہیں اور عالمی منظر نامے میں ان میں سے کون کون سے فراہم ہوگئے ہیں جن کی بنیاد پر عالم گیریت کا شور ہے۔سموئیل پی ہنٹنگٹن کہتے ہیں :

> کسی ثقافت یا تہذیب کے مرکزی عناصر زبان اور مذہب ہوا کرتے ہیں ۔ اگر ایک آفاقی تہذیب ظہور میں آرہی ہے تو ایک آفاقی زبان اور ایک آفاقی مذہب کے ظہور میں آنے کے رجحانات بھی نمایاں ہونے چاہیں ۔[۹]

زبان کا ثقافت کے ساتھ تعلق اور زبان اور ثقافت کے ایک دوسرے پر اثرات کے حوالے سے ڈاکٹر غلام علی الانا کہتے ہیں :

> انسانی وجود زبان سے الگ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا ہے۔ زبان ہی نے ہمیشہ ثقافت کو پروان چڑھایا ہے۔ اس لحاظ سے کسی ملک اور قوم کی ثقافت کا مطالعہ اس قوم اور ملک کی زبان ، تہذیب وتمدن اور معاشرے کا مطالعہ تسلیم کیا جائے گا۔[۱۰]

عالم گیریت کے حوالے سے پہلے زبان کے معاملے کو لیجیے ۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ انگریزی بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن یہ رابطہ کس سطح کا ہے ،ظاہر ہے کہ سیاسی اورکاروباری سطح کا رابطہ ہے۔ اور یہ کوئی اتنی بڑی

تبدیلی نہیں کہ اس کی بنیاد پر یہ کہا جائے کہ دنیا میں انگریزی بولنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ جیسا کہ وال سٹریٹ جنرل کے ایڈیٹر نے کہا:''عالمی زبان انگریزی ہے''[۱۱] سموئیل اس سے متفق نہیں :

> دنیا میں زبانوں کے استعمال کے حوالے سے تین برسوں پر محیط اعدادوشمار واضح کرتے ہیں کہ اس حوالے سے کوئی ڈرامائی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ دنیا میں انگریزی بولنے والوں کا تناسب 1958ء میں 9.8فی صد سے کم ہوکر 1992ء میں 7.6فی صد ہوگیا مغرب کی پانچ بڑی زبانیں (انگریزی ،فرانسیسی ، جرمن ،پرتگالی، ہسپانوی بولنے والوں کا تناسب 1958ء کے 24.1فی صد سے کم ہوکر 1992ء میں 20.8فی صد ہوگیا۔[۱۲]

انگریزی زبان کی اہمیت سے انکارممکن نہیں کہ وہ اس وقت علمی و سائنسی اعتبار سے زرخیز ہے اور اپنے پاس دنیا کی دیگر زبانوں کو دینے کے لیے بہت کچھ رکھتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں زبانوں کے حوالے سے مریضانہ احساس کمتری بھی انھیں انگریزی سیکھنے اور بولنے کی طرف راغب کر رہا ہے۔چین کی مثال اس حوالے سے عام طوری پر دی جاتی ہے کہ انھوں نے انگریزی سیکھے بولے بغیر ترقی کے مراحل طے کیے لیکن وہ بھی اب اس کی اہمیت کو سمجھ رہے ہیں اور انگریزی سیکھنے کا رجحان چینی قوم میں بتدریج بڑھ رہا ہے اسی مقالے میں قاضی جاوید کا مشاہدہ اس حوالے سے شامل ہے۔ اس لیے فی الوقت انگریزی کو عالمی رابطے کی زبان کہنا بجاہے تاہم عالم گیریت کے تناظر میں انگلش کا فروغ بہت کم تناسب کے ساتھ ہے ۔اس لیے یہ عالم گیریت کے لیے روشن امکانات کا حامل نہیں ۔ تاریخ بھی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ہردور میں کوئی زبان اہم ہوکر دیگر زبانوں سے آگے تو نکلی لیکن کوئی زبان کبھی عالمی زبان کے درجے پر فائز نہیں رہی۔

تراجم کے ذریعے اپنی زبان کومحفوظ کرنے اور جدید علوم سے روشناس ہونے کا عمل بھی اس بات کی شہادت دیتاہے کہ لوگ اپنی زبانوں کے حوالے سے فکرمند ہیں اور وہ اپنے اس اثاثے سے دست بردار ہونے کے لیے تیارنہیں جو زبان کی صورت میں ان کے پاس موجود ہے۔سموئیل اس پرایک اور زاویے سے بھی نظر ڈالتے ہیں:

> لنگوافرانکا لسانی اور ثقافتی اختلافات سے نمٹنے کا ایک طریقہ ہے نہ کہ انھیں ختم کرنے کا ۔ یہ اظہار خیال کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں نہ کہ تشخص اور برادری کا، کیوں کہ ایک جاپانی بینک کار اور ایک انڈونیشی تاجر کا آپس میں انگریزی میں اظہارخیال یہ ثابت نہیں کرتا کہ دونوں میں کوئی ایک مغربی ہوگیا ہے یا انگریز۔ اسی طرح نہرو کے منصوبوں کے خلاف ہندوستان میں انگریزی کا قومی زبان کی شریک کے طور پر استعمال اس امر کی شہادت ہے کہ ہندوہستان کے ہندی نہ بولنے والے لوگ اپنی زبان اور ثقافتوں کومحفوظ کرنا چاہتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتاہے کہ ہندوستان میں ایک کثیر لسانی معاشرے کی ضرورت باقی ہے۔[۱۳]

اب مذہب کے معاملے کو لیجیے مذہبی حوالے سے دنیا کو دوحصوں میں تقسیم کیا جاسکتاہے، ایک مذہب پرست گروہ دوسرا مذہب بیزار۔ اس گروہی تقسیم میں مذہب پرستوں کا پلڑا بھاری ہے۔لیکن ان کی داخلی تقسیم انھیں بہت چھوٹی چھوٹی اکائیاں بنادیتی ہے۔اس کے باوجودسموئیل ایک عالمی مذہب کے امکان پر بات کرتے ہیں :

> آفاقی زبان کے بجائے ایک آفاقی مذہب کےظہور میں آنے کا امکان موجود ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں دنیا بھر

میں مذاہب کا ایک عالمی احیا دیکھنے میں آیا اس احیا میں مذہبی تصور اور بنیاد پرستی کی تحریکوں کی شدت شامل ہے۔[۱۴]

پھر وہ جو اعداد وشمار درج کرتے ہیں ان کے مطابق دنیا میں مذہب بیزار لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ 1900ء میں 0.2فی صد دہریے تھے جو 1980ء میں دنیا کی آبادی کا 20.9فی صد ہو گئے ۔غور کیجیے ایک طرف مذہب پرستی بڑھ رہی ہے اور دوسری طرف مذہب بیزاری ۔ ایسے میں مذہبی عالم گیریت کا کوئی امکان مستقبل قریب میں موجود نہیں اور پھر اگر اسے ایک اور زاویے سے دیکھا جائے کہ مذاہب میں افتراقات کی خلیج کم کر کے انھیں ایک عالمی مذہب میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو اس کے امکانات بھی معدوم ہیں کیوں کہ اختلافات کی نوعیت بہت گہری ہے اور اس پر انسان کی نفسیات کہ وہ اپنی منفرد پہچان کی طرف زیادہ لپکتا ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں چند مذاہب کو ملا کر ایک نئے مذہب کے اجرا کی کوشش دینِ الٰہی کی صورت میں اکبر کے دور میں ہوئی لیکن اسے پذیرائی نہ مل سکی وہ محض بادشاہ کی ذہنی الجھنوں کی غمازی کرتی ہے۔

عالمی مذہب کے ظہور کے حوالے سے ایک اور امکان بھی پیش نظر ہونا چاہیے کہ مروج مذاہب میں سے کوئی مذہب عالمگیر حیثیت اختیار کر لے ۔عیسائیت اور اسلام دنیا کے دو بڑے مذاہب ہیں۔گزشتہ سالوں میں ان میں مکالمے کے امکانات بھی پیدا ہوئے ۔اردن کے اسلامی فکر کے حامل رائل اہل بیت انسٹی ٹیوٹ نے یورپ اور مسیحی دنیا کے دوسرے ممتاز رہنماؤں کے نام ایک کھلا خط جاری کیا جس پر نامور اسلامی مفکرین نے دستخط کیے اس میں کہا گیا تھا کہ:

> مسلمان اور عیسائی تعداد میں دنیا کی نصف آبادی سے بھی زیادہ ہیں لہٰذا جب تک ان کے درمیان امن و انصاف قائم نہ ہوگا دنیا بامعنی امن و استحکام سے محروم رہے گی ۔گویا دنیا کے مستقبل کا دارومدار مسلمانوں اور مسیحیوں کے باہمی تعلق پر ہے۔[۱۵]

اس لیے دونوں مذاہب میں مشترک بنیادیں تلاش کر کے عالمی امن کی راہ ہموار کی جائے۔ عالمی مسیحی حلقوں میں بھی اس خط کا بھرپور خیر مقدم ہوا ،چند کانفرنسیں بھی ہوئیں جن میں سے ایک اٹلی کے شہر میلان میں اکتوبر 2009ء میں ہوئی اس کا عنوان "A Common Word" ''حرف مشترک''اسی تحریک کا عکاس تھا جو کھلے خط کی صورت میں شروع ہوئی ۔ مکالمے کی یہ صورت اختلافات کی خلیج کو کم تو کر سکتی ہے اگر یہ کام یابی سے ہم کنار ہو جائے ۔لیکن ایک آفاقی مذہب کا تصور یہاں بھی واضح نہیں ہوتا۔ رہ گئی بات مذہب بیزار لوگوں کی تعداد بڑھنے کی تو اسے مذہب پرست لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ رکھ کر دیکھیے ۔ یوں لگتا ہے کہ سوئے ہوئے لوگ نیند سے بیدار ہو کر اپنے وجود کا ثبوت دے رہے ہیں خواندگی میں اضافے سے دونوں طرف شدت پیدا ہو رہی ہے تاہم مذہب بیزاری میں اضافہ نظر آتا ہے اور مذہبی شدت اس صورتحال پر قابو پانے کی کوشش ہے جو مذہب پرستوں کی طرف سے کی جارہی ہے ایسے میں مذہب بیزاری بھی عالمی تناظر میں واحد یا غالب گروہ کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتی دکھائی نہیں دیتی ۔ اس لیے عالمی مذہبی احیا کے حوالے سے سموئیل سے اس حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ مذاہب میں بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے لیکن کوئی ایک مذہب اس دوڑ میں اتنا آگے نکل جائے کہ دیگر مذاہب معدوم ہو جائیں ایسا امکان مستقبل بعید میں بھی نظر نہیں آتا۔

9,10اکتوبر2002ء میں بیجنگ میں ''ثقافتی مکالمہ کے امکانات اور حدود'' کے عنوان پر ایک کانفرنس ہوئی جس کا احوال قاضی جاوید رقم کرتے ہیں وہ اس میں پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ کانفرنس کے پہلے سیشن میں وہ ایک صاحب کے مقالے کا

حوالہ دیتے ہیں :

سکاٹ لینڈ کی ابرڈین یونیورسٹی کے رونلڈ رابرٹ سن نے جولائی 2002ء میں پیرس میں منعقدہ سوشیالوجی کی عالمی کانگریس میں ایک اور ممکنہ سمت ڈھونڈی ،وہ کہتے ہیں کہ ہماری دنیا میں ایک طرف تو گلوبلائزیشن ہو رہی ہے،فاصلے کم ہو رہے ہیں ،قومیں ایک دوسرے کے نزدیک آ رہی ہیں ، دنیا ایک عالمی گاؤں بن رہی ہے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک اور عمل بھی رواں دواں ہے اور یہ عمل گلوبلائزیشن کے بالکل الٹ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مقامی اور علاقائی خصوصیات پر پہلے سے زیادہ زور دیا جانے لگاہے۔ یہ مقامیت کا عمل ہے اس کا چرچا کم ہوا ہے لیکن وہ جاری و ساری ہے۔[۱۶]

ان کی یہ بات نظرانداز نہیں جاسکتی کہ عالم گیریت کے اس چرچے میں مقامیت بھی فروغ پا رہی ہے اور علاقائی تنظیمیں وجود میں آ رہی ہیں ،اس کے باوجود کہ عالمی تنظیمیں موجود ہیں پھر علاقائی تنظیموں کا فروغ عالم گیریت کا اشارہ تو نہیں بنتا۔ ولیم ووڈ رف کہتے ہیں :

گزشتہ ساٹھ سال کے شواہد کی بنا پر مزید روشن امکانات یہ ہیں کہ مخاصمت کی بجائے ملکوں کے درمیان رضا کارانہ معاشی اور سیاسی تعاون فروغ پا رہا ہے ۔ دو قطبی کشاکش میں کمی کے ساتھ اب عالمگیر فوجی اتحاد کے ساتھ ایسے علاقائی اتحاد بنانے پر زور دیا جارہا ہے جو مذہبی ،ثقافتی اور معاشی بندھنوں اور مفادات پر مبنی ہوں ۔[۱۷]

اس ضمن میں وہ یورپی یونین,OECD،ایشیا پیسفک اکنامک کواپریشن ،عرب لیگ،ایسوسی ایشن آف ساؤتھ ایشین نیشنز، برطانوی دولت مشترکہ ، یورپین فری ٹریڈ ایسوسی ایشن (EFTA) دی آرگنائزیشن آف امریکن سٹیٹس (OAS)اور افریقن یونین (AU) کی مثالیں دیتے ہیں ۔

سرد جنگ کے خاتمے پر جو خیال پیدا ہوا تھا کہ اب دنیا میں جھگڑوں کی بنا موجود نہیں رہی اس لیے تاریخ کا خاتمہ ہوگیا ہے اس بات کا اظہار یہ تھا کہ اب دنیا ایک عالمی گاؤں کی صورت اختیار کر لے گی ۔لیکن اوپر بیان کی گئی علاقائی تنظیمیں اس تصور کی نفی کرتی ہیں اور اس تصور کو اجاگر کرتی ہیں کہ علاقائی سطحوں پر جھگڑوں کو کم کر کے تعاون کے فروغ کی سعی کامران ہو رہی ہے۔ عالمی سطح پر نہیں ۔سموئیل کہتے ہیں :

سرد جنگ کے اختتام نے جھگڑے کو ختم نہیں کیا بلکہ ثقافت میں جڑیں رکھنے والی نئی شناختوں کو فروغ دیا ہے اور مختلف ثقافتی گروپوں ،جو وسیع سطح پر تہذیبیں ہیں ، کے مابین جھگڑے کی نئی صورتوں کو ابھارا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشترک ثقافت ان ریاستوں اور گروپوں میں تعاون کو بڑھاتی بھی ہے۔ جو اس ثقافت کا جزو ہوتے ہیں اس کا مشاہدہ ملکوں کے مابین رونما ہونے والے علاقائی اتحادوں کی صورتوں میں کیا جاسکتا ہے۔خصوصاً معاشی شعبے میں۔[۱۸]

عالم گیریت کے بڑھتے ہوئے شعور میں علاقائیت کے احساسات کا جاگنا اس بات کا اعلان ہے کہ لوگ عالم گیریت کے حق میں نہیں ہیں ۔گزشتہ اوراق میں صارفی کلچر کے ذریعے عالم گیریت کے بڑھنے کی بات کی ۔ ارسن میگڈووسکی کہتی ہیں:

اگرچہ مغرب کا صارف اور پاپولر کلچر دنیا بھر میں پھیل گیا ہے لیکن اس کے عالمی پھیلاؤ سے یہ نہ سمجھیئے گا کہ کوئی عالم

گیر مشترک کلچر وجود میں آ گیا ہے۔ نہیں نہیں ، ایسا نہیں ہے۔ نہ ہی کبھی ہوگا ۔ جو لوگ اس قسم کا تصور رکھتے ہیں وہ امریکی یا مغربی ثقافتوں کی یک رنگی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کوکا کولا اور میکڈونلڈ کا برگر مغربی تہذیب کا نمونہ نہیں ہے۔ اس تہذیب کا نمونہ اس کی بنیاد اور اس کی شناخت میگنا کارٹا ہے۔[۱۹]

یاد رہے کہ میگنا کارٹا وہ منشور ہے جو انگریز جاگیر داروں نے 15 جون 1215ء کو بادشاہ جان سے منظور کروایا تھا اور جس کے وسیلے سے مغرب میں انگریزوں کو شخصی اور سیاسی آزادی حاصل ہوئی۔ اس لیے مغربی تہذیب اگر پھیل رہی ہے تو دنیا میں شخصی اور سیاسی آزادی کا چرچا ہونا چاہیے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے اسے مغربی تہذیب کی توسیع سمجھنا خام خیال ہے۔ عالم گیریت اور مقامیت کے دوش بدوش بڑھتے ہوئے رسوخ کے لیے ایک انگریز ماہر سماجیات نے Globalization کی اصطلاح وضع کی ہے جو گلوبل اور لوکل کو ملا کر بنائی گئی ہے۔ یہ اصطلاح موجودہ صورت حال کی صحیح عکاسی کرتی ہے اور دنیا میں اگر اختلافات کی خلیج کم کر کے مختلف ثقافتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا ہے تو وہ عوامل دریافت کرنا ہوں گے جن کی بنیاد پر مکالمہ شروع ہو اور پائیدار امن کی بنیادیں فراہم ہوں ۔ انسانی حقوق کو ہر مذہب ہر تہذیب اور ہر قوم مقدم سمجھتی ہے اس سے انکار ممکن نہیں اس کی بنیاد پر ایسی اجتماعیت تشکیل دی جائے بلکہ اجتماعیت تو اقوام متحدہ کی شکل میں موجود ہے اسے مکمل غیر جانبدار ادارہ بنا کر اس حوالے سے فعال کیا جائے ۔ تو وہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو عالم گیریت کے خواب میں دیکھے جا رہے ہیں ۔

لیکن یہ بات یاد رہے کہ یہ ثقافتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا عمل ہے ۔ ثقافتی ادغام کا عمل نہیں ہے کیوں کہ:

> عمرانی نفسیات کا امتیازی نظریہ بتاتا ہے کہ لوگ خود کو ایک مخصوص تناظر میں دوسرے لوگوں سے ممتاز کر کے دیکھتے ہیں ۔ لوگ اپنی شناخت اس زاویے سے وضع کرتے ہیں کہ وہ کیا نہیں ہیں ۔ ذرائع مواصلات ، تجارت اور سفر میں ارتقا کے باوجود لوگوں میں اپنی تہذیبوں سے ربط کا احساس زیادہ مضبوط ہوا ہے۔[۲۰]

اس ضمن میں ایسی ثقافتیں بالخصوص مطالعہ کی جا سکتی ہیں جو اقلیت میں ہیں ۔ کم تعداد میں ہونے کے باوجود وہ اپنی شناخت گم نہیں کر رہیں بلکہ اس کی بازیافت اور زندگی پر مصر ہیں ۔ سکھ کمیونٹی کی مثال اس حوالے سے بہت مضبوط ہے جن کی تعداد بہت کم ہے اور روزگار کے حوالے سے بیرون ممالک بھی مقیم ہیں لیکن جہاں بھی رہتے ہیں اپنے کلچر سے بیگانگی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ فخر سے پگڑی باندھ کر پنجابی بولتے ہیں اور بھنگڑے ڈالتے ہیں اور اپنی فلموں میں اپنی ثقافت کو زندہ رکھنے کی ان کی کاوشیں کامیابی سے ہمکنار ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔

عالم گیریت ایسا مظہر نہیں جو وقوع پذیر ہو چکا بلکہ امکانی صورت حال سے دو چار ہے ۔ اس لیے ہم اس کے نتائج کے حوالے سے جو بات کر رہے ہیں وہ بھی بیشتر امکانی تناظر میں اور کچھ ان اشاروں کی مرہون منت ہے جو عالم گیریت کا اظہار کر رہے ہیں۔ قاضی جاوید کے خیال میں عالم گیریت کے موجودہ عمل کو بدلنا ضروری ہے کیوں کہ اس سے غریب قوموں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

> وہ (قومیں) سمجھتی ہیں کہ ان کی ثقافتیں ، ان کی اقدار، ان کے انداز زندگی اور ان کا تشخص خطرے کی زد میں آ گیا ہے یہ تاثر غلط بھی نہیں ہے ان کی ثقافتیں اور اقدار ابھی خطرے میں ہیں ۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ دنیا کی چھوٹی

زبانیں کس قدر تیزی سے ختم ہو رہی ہیں ۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ گلوبلائزیشن کا سیلاب آئندہ برسوں میں ایشیا اور افریقہ کی نوے فی صد زبانوں کو لے ڈوبے گا۔ وہ صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گی۔[۲۱]

زبان کے مرنے سے اور زبان کے فروغ سے ثقافت کا تعلق محتاج بیان نہیں اس لیے مرتی ہوئی زبانیں اپنے کلچر کو بھی ساتھ لے جائیں گی ۔ یوں چھوٹی زبانوں کے حامل عالم گیریت سے خوفزدہ ہیں ۔ مقامیت کا عمل یقینی طور پر اس کا ردعمل ہے۔

مسلمانوں میں عالم گیریت کے خلاف جو ردعمل پایا جاتا ہے وہ پوری دنیا بالخصوص مغربی ممالک کے مسلمانوں کے حوالے سے زاویہ نظر کے باعث ہے۔ کچھ اتفاقی یا پیدا شدہ واقعات کو بنیاد بنا کر مسلم کمیونٹی کو پوری دنیا میں دہشت گروں کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اور اسے فرد کے بگاڑ سے منسوب نہیں کیا جا تا بلکہ اس کا ذمہ دار اسلام کو ٹھہرایا جاتا ہے اور بہت سا پراپیگنڈا اس معاملے کو فروغ دینے کے لیے کیا جارہا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ مسلمان وحشی ہیں ،جنگلی ہیں اور اسلام تہذیبی حوالے سے فرسودہ مذہب ہے۔ قاضی جاوید اسے امریکیوں کی سوچی سمجھی منصوبہ بندی قرار دیتے ہیں:

> امریکیوں کا مسئلہ یہ ہے کہ تین نسلوں سے وہ سرد جنگ کی کیفیت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اب ان کو اس فضا اور اس سے پیدا شدہ طرز زندگی کی عادت ہوگئی ہے۔ جب ان کا رقیب سوویت یونین ، ان کی طرف سے براہ راست کوشش کے بغیر اپنے بوجھ تلے دب کر مر گیا تو امریکی بھی بدحواس ہوگئے وہ سوچنے لگے کہ کسی دشمن کی موجودگی کے بغیر وہ پنا اجتماعی طرز حیات کیوں کر برقرار رکھ سکیں گے ۔ یوں ان کی عادت نے ان کو نیا دشمن تلاش کرنے پر مجبور کردیا۔ جب ان کو کوئی حقیقی دشمن نہ ملا تو انھوں نے اپنی نفسیاتی ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسلام اور مسلم دنیا کا ہوّا کھڑا کردیا۔۔۔یوں آخر کار مسلم اور مغربی تہذیبوں کے درمیان تصادم کی فضا تیار ہوگئی ۔[۲۲]

اگر قاضی جاوید کا پیش کردہ یہ تناظر درست ہے تو مغربی میگنا کارٹا کے پس منظر میں اس صورت حال کو دیکھیے کیا وہ تہذیب مثبت اقدار کے ساتھ عالمی گاؤں بنانے کی طرف قدم اٹھا رہی ہے یا یہ عالم گیریت بھی وہی استعماری مقاصد رکھتی ہے جو جنگوں اور نو آبادیوں کی صورت میں دنیا پر رائج رہے ہیں ۔ یقینی طور پر صورت حال استعماری ہے۔ بس جال نیا ہے جو پرانے شکاری اٹھا کر لائے ہیں اس لیے مسلمانوں میں عالم گیریت کے حوالے سے تحفظات اور خوف ہے اور اس کے نتیجے میں مغرب مخالف اقدامات ، ان کی بقا سے منسلک ہیں ۔

عالم گیریت سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ مالی اعتبار سے اس کا جواب ''غربت میں کمی'' دیا جاتا ہے اس لیے عالم گیریت کو دنیا کی ترقی قرار دیا جاتا ہے لیکن اس اعتبار سے عملاً صورت حال کیا ہے یہ جاننے سے پہلے ہنری جارج سے رجوع کرتے ہیں جو غربت اور ترقی کے متوازی بڑھنے پہ حیران ہیں :

> ترقی کے ساتھ غربت کی وابستگی ہمارے دور کا زبردست معمہ ہے ۔ یہ وہ پہیلی ہے جو قسمت کے ابولہول نے ہماری تہذیب کے سامنے رکھی ہے۔ اور اس کا جواب نہ دینا تباہ کن ہوگا۔[۲۳]

ایسے میں دنیا میں ترقی کا واویلا اور غربت میں اضافہ عالمی صورت حال کا جو منظر پیش کرتا ہے وہ یقیناً قابل ستائش نہیں ہے اور یہ اس بڑھتے ہوئے فاصلے کی نشان دہی کرتا ہے جو کسی غیر ترقی یافتہ ملک میں امیر اور غریب کے درمیان ہوتا ہے۔ دنیا میں امیر

اور غریب ممالک میں فاصلہ اسی اعتبار سے بڑھتا جا رہا ہے۔

> اس بات کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا کہ حالیہ عشروں میں دنیا بھر میں دولت کی فراوانی دولت کے پیانے میں نچلی سطح تک نہیں پہنچی ۔ عالمی سطح پر یہاں تک کہ ریاست ہائے متحدہ میں بھی غربت بڑھ رہی ہیں ۔ 1945 سے 1965 کے درمیان دولت کی بے مثال فروانی کے دور میں ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ ملکوں ۔۔۔پہلی اور تیسری دنیا کے ملکوں کے درمیان فرق اس وقت بھی بڑھ رہا ہے۔ کیوں کہ دنیا کی آبادی کا چھٹا حصہ دنیا کی حقیقی آمدنی کا 70 فی صد حاصل کر رہا ہے۔ 2004ء میں دنیا کی آبادی کے محض ایک فی صد کے پاس دنیا کے 57 فی صد غریبوں کی مجموعی دولت کے برابر دولت تھی ۔[۲۴]

اعداد و شمار کا گورکھ دھندہ اس سے بھی زیادہ خوف ناک ہوتا جا رہا ہے پھر یہ کیسی عالم گیریت ہے جو دولت کی تقسیم میں عدم مساوات کو بڑھا وا دے رہی ہے۔اور ایسے میں عالمی امن کی باتیں کیسے کی جاسکتی ہیں کیوں کہ دو انتہاؤں پہ رہنے والے کبھی امن کی حالت میں نہیں رہ سکتے۔ ولیم کہتے ہیں :

> غریب اور امیر تر ملکوں کے درمیان تعلقات ایک تناقص پر پہنچ چکے ہیں۔ امیر اور غریب کے درمیان دولت کی عدم مساوات نے تیسری دنیا کو پہلی دنیا کا مظہری مقروض بنا دیا ہے۔ ایک طرف غریب ملکوں کی طرف سے قرضوں کی ادائیگی انھیں مزید غربت کا شکار کر رہی ہے تو دوسری طرف دنیا کے امیر ترین حصے ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ دونوں دنیاؤں کا سرمایہ مسلسل ہڑپ کرتے جا رہے ہیں ۔جس قدر رقم تیسری دنیا کو قرضے میں دی جاتی ہے وہ انجام کار قرضوں کے سود اور مفرور سرمائے کی صورت میں واپس امریکہ اور یورپ کو آجاتی ہے۔[۲۵]

یہ نمونہ مشتے از خروارے ہے جو معاشی ترقی کے خواب دکھانے پر سامنے آرہا ہے۔ عالم گیریت کی دعویدار دنیا میں ترقی یافتہ ممالک اور تیسری دنیا کے ممالک میں حالات کو معمول پر لانے کی کوششیں اس بڑھتے ہوئے معاشی فرق سے بخوبی سمجھی جا سکتی ہیں اور یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ عالم گیریت دراصل ترقی یافتہ ممالک میں تقسیم دولت کا نیا نظام ہے جسے سمجھنا ترقی پذیر ممالک کے لیے بہت ضروری ہے۔

امریکہ میں کثیر الثقافتی معاشرے کی کایا پلٹ سے متاثر ہوکر اور اس تجربے میں کامیابی کے امکانات دیکھتے ہوئے جو ایک قومی ثقافت کی صورت میں انھیں نظر آئے،امریکی یہ چاہتے ہیں کہ اس تجربے کو پوری دنیا پر کیا جائے اور اس کے مثبت نتائج کی امید رکھتے ہیں ۔ اس لیے وہ اپنی ثقافت کی توسیع عالم گیریت کی صورت میں کرنے کے خواہاں ہیں ۔ جب سے اس پہ بحث کا آغاز ہوا دنیا میں ایسے مظاہر تلاش کر کے اجاگر کیے جا رہے ہیں جو دنیا کو ایک ''عالمی گاؤں'' ثابت کرتے ہیں اس ضمن میں لباس اور خوراک کے چند مظاہر بالخصوص تہذیبی یکسانیت ثابت کرنے کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں ۔لیکن تہذیبی عالم گیریت نہ تو لباس پر استوار ہوسکتی ہیں نہ خوراک میں شامل ایک دو اشیا کے پوری دنیا میں مشترک ہونے سے اسے اساس ملتی ہے۔

یہ عالم گیریت کے اظہار کی نہایت بھونڈی صورت ہے جو اپنی فطرت میں وہی خصائص رکھتی ہے جو میک اپ کی روح ہوتے ہیں ۔ اس لیے حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس صورت حال کو سمجھنے اور منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے ۔ دنیا میں موجود

بے شمار ثقافتی اکائیوں کو ختم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ثقافتی اظہار میں تنوع دنیا کی دلکشی کا ضامن ہے اور اس سے صرف نظر کرنا عالمی طاقتوں کے ایجنڈے میں اس لیے شامل ہے کہ وہ دنیا کو دولت کے بہاؤ کے حوالے سے سوچتے ہیں ۔ اس لیے انھیں ثقافتی جمالیات سے آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں مغربی طرز ندگی کے اثرات ساری دنیا پر ایک حد تک نظر آتے ہیں ۔آنے والے دور میں ان کی چکا چوند زیادہ بھی ہوسکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ دنیا میں ثقافتی وتہذیبی بُعد ختم ہو جائے گا ۔ یہ فاصلے اور اختلافات جو ازل سے دنیا کا حصہ ہیں اسی طرح رہیں گے ۔ البتہ ایسی جہتیں دریافت کی جاسکتی ہیں جو انسان کو ایک دوسرے کے قریب لائیں اور مغائرت کی فضا ختم ہو ۔ ورنہ اس وقت تو صورت حال عالمی امن کے حوالے سے انتہائی مخدوش ہے۔ولیم ورڈرف کا تجزیہ ہے:

> عالمی امن کو خطرہ چاہے یہ معاشی ،روحانی یا سیاسی ذریعہ سے ہو ۔۔۔اسی طرح سنگین ہے جیسے یہ 1500ء میں تھا ۔ اگرچہ آج کل کوئی عالمی جنگ نہیں لیکن مختلف ملکوں میں ماضی کے مقابلے میں بہت زیادہ خانہ جنگیاں ہورہی ہیں ۔ 2005ء میں دنیا بھر میں تقریباً چالیس داخلی تنازعات شدت پسندی کا ذریعہ بنے ہوئے تھے ۔اندھی طاقت،حکمت عملی ، اور مفادات ہی بین الاقوامی تعلقات کی زبان رہے ہیں۔ اخلاقیات ،محبت ، رضا کارانہ تعاون اور بین الاقوامی قانون نے گزشتہ پانچ سو برسوں سے عالمی امور کے نتائج کا تعین نہیں کیا اس کی بجائے متصادم مفادات اور طاقت کی بدلتی ہوئی سطحوں نے فیصلہ کن عوامل کا کردار ادا کیا ہے۔ [۲۶]

یہ ہے وہ دنیا جو عالم گیریت کی طرف بڑھ رہی ہے۔جس میں حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں کی دوڑ انسانیت کے ساتھ ساتھ ’’عالمی گاؤں‘‘ بنانے والوں کے منہ پر زور دار طمانچہ ہے ۔جو اندھی طاقت کے استعمال سے دنیا میں امن قائم کر کے اسے انسان کے لیے رہنے کی جگہ بنانے کے مقدس فریضے کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مبارک علی،ڈاکٹر،’’گمشدہ تاریخ‘‘ لاہور،فکشن ہاؤس،۲۰۰۵ء،ص۴۶

۲۔ ایضاً،ص۴۷

۳۔ سموئیل پی ہنٹنگٹن،’’تہذیبوں کا تصادم‘‘،ترجمہ: احسن بٹ،لاہور، مثال پبلی کیشنز۔۲۰۰۳ء،ص۸۹

۴۔ ایضاً،ص۸۹

۵۔ برٹرینڈ رسل ،’’برٹرینڈ رسل کے فکر انگیز مضامین‘‘ ، ترجمہ،جمشید اقبال، ملتان،بیکن بکس،۲۰۰۹ء،ص۶۳

۶۔ ایضاً،ص۱۱۲،۱۱۳

۷۔ ایضاً ص۱۱۳،۱۱۴

۸۔ ولادیسلاف کیلے، ماتوئے کوائیزون،’’تاریخی مادیت‘‘،ترجمہ: مرزا اشفاق بیگ،کراچی،سٹی بک پوائنٹ۔۲۰۰۷ء،ص۱۲۳

۹۔ سموئیل پی ہنٹنگٹن،’’تہذیبوں کا تصادم‘‘،ص۸۵

۱۰۔ جی اے الانا،ڈاکٹر’’زبان اور ثقافت‘‘، اسلام آباد،علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۱۹۸۷ء،ص۵۱

۱۱۔ سموئیل پی ہنٹنگٹن، ''تہذیبوں کا تصادم''، ص۸۵

۱۲۔ ایضاً،ص۸۵

۱۳۔ ایضاً،ص۸٦

۱۴۔ ایضاً،ص۸۷

۱۵۔ قاضی جاوید،''تاریخ وتہذیب''،لاہور،فکشن ہاؤس۔۲۰۱۰ء،ص۲۸۲

۱٦۔ ایضاً،ص۲۴۰

۱۷۔ ولیم ووڈرف،''جدید دنیا کی مختصر تاریخ''،ترجمہ:راشد مراد،لاہور، دارالشعور۔۲۰۰۸ء،ص۵۲۳

۱۸۔ سموئیل پی ہنٹنگٹن،''تہذیبوں کا تصادم''،ص۱٦۴

۱۹۔ قاضی جاوید،''تاریخ وتہذیب''،ص۲۷۲

۲۰۔ سموئیل پی ہنٹنگٹن،''تہذیبوں کا تصادم''،ص۸۹

۲۱۔ قاضی جاوید،''تاریخ وتہذیب''،ص۲۵۳

۲۲۔ ایضاً،ص۲۵۳،۲۵۴

۲۳۔ ولیم ووڈرف،''جدید دنیا کی مختصر تاریخ''،ص۵۱۳

۲۴۔ ایضاً،ص۵۱۲

۲۵۔ ایضاً،ص۵۱۳

۲٦۔ ایضاً،ص۵۱۹